

اردو کی تحریکیں۔۔۔ رد عمل کا نتیجہ

Change is the raison de'tre of human life. According to this rule there exist changes in Literary movements of Urdu. All literary movements of urdu are the result of reaction of the previous movements. Sometimes there is social reaction , sometimes there is reaction of some foreign movements. From Ameer Khusroo's to Halqa Arbab-e-zauq all movements of urdu are due to reaction. In this article these reactions of Urdu movements are discussed.

اردو تحریکوں کا آغاز ریختہ کی تحریک سے ہوتا ہے۔ ریختہ کی تحریک کو دو چھوٹی تحریکوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس میں ایک تحریک امیر خسرو کی ہے۔ یہ تحریک دراصل صوفیا کی تحریک کا ہی حصہ ہے۔ بھگتی تحریک بھی اسی دور میں پنپ رہی تھی۔ امیر خسرو تحریک، صوفیا کی تحریک اور بھگتی تحریک یہ سب مل کر ریختہ کی تحریک کا پہلا حصہ ہیں۔ بھگتی کی تحریک نے فرد کو اعتدال اور سکون فراہم کیا، اس سکون اور توازن میں فرد نے روحانی سکون اور روحانی رفعت حاصل کی۔ یہ تحریک معاشرے میں اصلاح کا بیڑہ اٹھانا چاہتی تھی جس میں کسی حد تک کامیابی بھی ملی۔ بھگتی تحریک، اخلاقی، اصلاحی اور انسانی مساوات کے پہلوؤں پر توجہ دیتی رہی۔ بھگتی تحریک کا اولین علمبردار ”رامانج“ تھا۔ اس کے شاگرد چیلے کھلاتے تھے۔ اس کا ایک اہم چیلہ بھگت کبیر ہے۔ بھگت کبیر ہی وہ چیلہ ہے جس کی وجہ سے اس تحریک کا ادبی پہلو سامنے آیا اور اس کی شاعری کی وجہ سے آج تک اس تحریک کا نام زندہ ہے۔

”بھگت کبیر نے ایک ایسی زبان میں شاعری کی جس کی ترقی یافتہ شکل بالآخر اردو زبان کی صورت اختیار کرنے والی تھی چنانچہ مسٹر بوس نے کبیر کو اس زبان کا پہلا بڑا شاعر کہا ہے اور بقول حافظ محمود شیرانی ان کی نظمیں اچھی خاصی اردو کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ کبیر نے ہندو اور مسلم تصورات کو متصادم کرنے کے بجائے انہیں باہم مدغم کیا تھا ان کی شاعری میں اردو اور فارسی کا امتزاج موجود ہے اور بعض ترجمے تخلیقی شان بھی رکھتے ہیں۔“ (۱)

بھگتی تحریک کا مقصد اصلاحی اور پریم کا پرچار تھا اس لیے اس وقت کی عوامی زبان میں شاعری کی گئی تاکہ عوام کے دلوں میں آسانی سے پیغام پہنچایا جاسکے۔

’بھگتی تحریک کی شاعری پر ایک اجمالی نظر ڈالیں تو اس کے چند ایک بنیادی اوصاف ابھرے ہوئے دکھائی دیں گے مثلاً ایک یہ کہ اس میں جنگل کی سی گیرائی ہے، اسی لیے اس کی فضا نیم تاریک، نیم شعوری ہونے کے ساتھ ساتھ، والہانہ پن لیے ہوئے ہے۔ دوسرا یہ کہ جنگل کے اثرات کے تحت اس شاعری نے بالعموم عورت کی طرف سے اظہار جذبات کی صورت اختیار کی ہے۔‘ (۲)

بھگتی تحریک کی اہم صنف گیت ہے۔ اسی دور کی ایک اور تحریک اور ریختہ کی ہی تحریک کا ایک پہلو امیر خسرو کی تحریک ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ امیر خسرو کی تحریک کا مقصد جہاں محبت اور امن کا پیغام تھا وہاں یہ تحریک زیادہ ادبی نظر آتی ہے۔ امیر خسرو نے زبان و بیان کو مد نظر رکھا۔ خسرو نے شاعری اور کلام کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور شاعری میں باقاعدہ نئی اصناف شامل کیں۔ اس تحریک میں ایک طریق یہ اختیار کیا گیا کہ مصرعہ اول فارسی زبان میں اور دوسرا مصرعہ اردو میں لکھا جانے لگا۔ خسرو کے اس طریق کو بعض دوسرے شعراء نے بھی برتا جن میں عشقی خان عشقی، حسن دہلوی، منشی ولی رام، محمد افضل پانی پتی جیسے نام شامل ہیں۔ اس کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز و صلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس کے بعد ایک ہی مصرعہ میں فارسی اور اردو کو ملا دیا گیا جس سے اظہار و بیان کو نئے نئے طریق ملنا شروع ہو گئے۔ خسرو نے اس انداز سے دوزبانوں کو ساتھ ساتھ چلانے کی کوشش کی جو کہ کچھ عرصہ بعد معدوم ہو گیا۔ اس تحریک کی اہم صنف جو آج تک زندہ ہے، وہ گیت ہے۔ بھگتی تحریک کے شعراء جنہوں نے اسے مقبول بنانے کی کوشش کی ان میں میر ابائی، کبیر اور ناکے شامل ہیں۔ صوفیا کی تحریک بھی ریختہ کی تحریک میں شامل ہے۔ اس تحریک میں مقامی زبانوں کی ترقی اور ان کے اشتراک سے ایک نئی زبان کی افزائش ہوئی۔ اس تحریک کا مقصد زبان کی ترقی یا ادبی ہرگز نہ تھا اور نہ ہی ادب کی تخلیق اس کے مقاصد میں شامل تھا بلکہ عوام سے رابطے کے لیے اس زبان کو اختیار کیا گیا۔ اس تحریک کا مقصد اصلاحی اور تبلیغی تھا مگر زبانوں کے اشتراک سے نئی زبان میں ترقی ہوتی چلی گئی۔ اس تحریک میں سماع کو بڑی اہمیت ملی اور لوگوں میں مقبول ہوئی۔

ریختہ کی ایک اور بڑی تحریک دلی دکنی کی صورت میں سامنے آئی۔ دلی سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سالوں تک کا شاعر ہے۔ ”مغل بادشاہ محمد شاہ کے دور حکومت کو یہ خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے دوسرے سال جلوس میں ولی کا دیوان دلی پہنچا“ (۳)

جغرافیہ سے پتہ چلتا ہے کہ دکن ایک قلعہ نما کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس علاقے کو پہاڑ اور دریا شمال کے میدانی علاقوں سے الگ کرتے ہیں۔ جب اورنگ زیب عالمگیر نے دکن کو فتح کیا تو بعد کی صورت حال کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

”مورخ فرشتہ نے سلطنت بہمنیہ کے باشندوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اولاً دکنی جو علاؤ الدین خلجی یا اس کے بعد عسا کر اسلامی کے ساتھ آئے اور دکن میں آباد ہو گئے۔ یہ لوگ دکنی اردو بولتے تھے۔ ثانیاً غریب جو ایران، ترکی اور افغانستان سے آئے اور یہیں آباد ہو گئے ان کی زبان فارسی تھی۔ ثالثاً حبشی جو ابی سینیا کے باشندے تھے اور عربی اور حبشی زبانیں بولتے تھے۔ ملک کے قدیم باشندے ملیالم، تملیو، مرہٹی اور تامل میں گفتگو کرتے تھے۔ دکن میں اردو علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں پہنچی۔ تاہم مقامی بولیوں کے اختلاط سے اس زبان کے خدو خال قدرے مختلف ہو گئے اور یہ شمالی ہندوستان کی اردو سے الگ دکنی زبان کہلانے لگی۔ بہمنی سلطنت کے زمانے میں دکنی زبان بول چال کی منزل سے نکل کر ادبی رتبے پر پہنچ گئی تھی۔ مثنوی نظامی دکنی اس دور کی یادگار ادبی تصنیف ہے۔“ (۴)

ادب کی اصناف میں اس دور کی اہم اصناف میں مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ نگاری ہے۔ ولی دکنی کا کمال یہ ہے کہ اس نے دکنی اور رنجی روایت کو ملا کر اردو ادب میں ایک نئی روایت کو فروغ دیا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ولی جدید شاعری اور جدید شعری روایت کا بانی ہے اور اس نئی تحریک کا نقطہ آغاز ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ولی کی تحریک کو اردو غزل کی نشاۃ اول کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

ریختہ کی تحریک کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں بھگتی کی تحریک، امیر خسرو کی تحریک، صوفیا کی تحریک اور ولی دکنی کی تحریک شامل ہے۔ بھگتی تحریک نے روحانی رفعت کا درس دیا اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور اصلاحی پہلوؤں کو بھی مد نظر رکھا۔ امیر خسرو کی تحریک جو کہ صوفیا کی تحریک کا ہی حصہ تھی۔ خسرو کی تحریک ذہنی رفعت کے ساتھ ساتھ ادبی پہلوؤں کی طرف زیادہ رجحان رکھتی ہے۔ اس میں رومانی اور ادبی پہلو واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ صوفیا کی تحریک کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عوام سے رابطے کے لیے عوام کی زبان کو استعمال کیا گیا اس کا مقصد اصلاحی اور تبلیغی تھا۔ ریختہ کی تحریک میں ولی دکنی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے فن کو حسن کی توصیف کا ذریعہ بنایا اور یوں کہا جاسکتا ہے کہ ولی نے خالص ادبی کام سرانجام دیا۔ یہ تحریک اپنے اصلاحی ادبی پہلوؤں کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی نظر آتی ہے جس کے اثرات کئی صدیوں تک بعد میں آنے والی تحریکوں میں موجود رہے۔

ایہام گوئی کی تحریک:

ولی دکنی اس نئی زبان (ریختہ، اردو) کے پہلے صاحب دیوان شاعر مانے جاتے ہیں۔ جب ولی نے اپنا دیوان اس نئی زبان میں پیش کیا تو فارسی گو شعرا کے ہاں رد عمل پیدا ہوا اس رد عمل کے اظہار کے طور پر محفلوں اور مشاعروں میں اردو کے خلاف تضحیک کا سلسلہ

چل نکلا۔ ریختہ کے مشاعرے بھی ہوتے رہے اور فارسی کے بھی، مگر اردو یا ریختہ کو جب فارسی کا مقابلہ شاعری میں کرنا پڑا تو اس نئی زبان کو مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح ایہام گوئی کا سہارا لینا ضروری سمجھا گیا۔ ردعمل کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اردو میں ریختہ کی تحریک میں صوفیا اور بھگتی تحریک نے نہایت سادگی سے روحانی اور اخلاقی درس دیا تھا تھوڑا بہت امیر خسرو اور ولی دکنی کے ہاں رومانی عناصر ملتے ہیں۔ اس سے اردو زبان جامد ہوتی نظر آ رہی تھی اور اس میں مزید ترقی اور پھیلاؤ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس وقت ایہام ایک ایسی تحریک کے طور پر اردو زبان میں سامنے آئی جس سے اس زبان کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر ہوئے۔

”ولی کی تحریک نے زبان کو جس نئے اسلوب سے آشنا کیا تھا وہ رومانی عناصر کی فراوانی کے باوجود ابھی تک کھر درا تھا۔ چونکہ ولی کے ہاں نمانوس الفاظ کا خاصہ بڑا انبار موجود ہے۔ اس لیے ولی کے اس اجتہاد کو توازن اور اعتدال کی راہ پر ڈالنے کی ضرورت موجود تھی۔ زبان کی ان ضرورتوں کو ولی کے شعرا نے پورا کیا اور نئی اردو کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرنے اور فنی صنعتوں سے روشناس کرانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس زاویے سے دیکھئے تو ایہام کی تحریک کلاسیکی نوعیت کی ہے اور ولی کی توانا تحریک کے بعد اس کا فروغ ایک فطری واقعہ نظر آتا ہے۔ (۵)

ایہام گوئی کی تحریک سے قبل اس کی کچھ مثالیں موجود ہیں۔ ایہام گوئی کی تحریک سے قبل ریختہ کی تحریک کے شعرا کبیر اور ولی دکنی کے ہاں بھی چند مثالیں نظر آتی ہیں۔

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کا کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

ولی دکنی کے ہاں مثال یوں ہے:

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل
اگر اس شمع روشن کی لگن ہے
موسیٰ جو آ کے دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

ولی کے کلام میں ایہام کی مثالیں دیکھ کر آئندہ آنے والے شعرا نے اس کام کو آگے بڑھایا جس سے ایہام ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اس تحریک کے شعرا میں خان آرزو، شیخ ثناء، عمر، رضی، سراج، داود، شاہ مبارک، آبرو، مضمون، یک رنگ وغیرہ اہم ہیں۔ اصلاح زبان کی تحریک۔ ایہام گوئی کا رد عمل:

کہا جاتا ہے کہ اصلاح زبان کے پیچھے سیاسی یا تہذیبی اثرات تھے۔ مگر اس نظریہ سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو محض ایک رد عمل

ہی کافی بڑا محرک تھا۔ ایہام میں اتنی زیادہ مدافعت نہ تھی کہ وہ اردو زبان کو فارسی کے مقابلے میں لاکھڑا کرتی لہذا میرزا مظہر جان جاناں نے اردو کی ترقی اور اس میں بہتری کرنے کے لیے یہ بیڑہ اٹھایا اور ریختہ کے اندر فارسی الفاظ اور تراکیب کا استعمال ضروری سمجھا گیا تا کہ اردو کا دامن الفاظ و تراکیب کے استعمال سے وسیع کیا جاسکے۔ میر تقی میر نکات اشعار میں لکھتے ہیں:

”فارسی کی محض وہ ترکیبیں لائی جائیں جو زبان ریختہ کے مناسب ہوں..... ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ کیلئے نامانوس ہوں معیوب ہیں۔ اس کا جانا بھی سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔ میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگر فارسی ترکیب گفتگوئے ریختہ کے مطابق ہو تو مضائقہ نہیں..... چھٹی قسم وہ انداز شعر ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی، گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی خیال وغیرہ پر مشتمل ہے۔ (۶)

کہا جاتا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں اصلاح زبان کی تحریک کا بانی ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے اصل میں دیکھا جائے تو رد عمل ہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر اصلاح زبان کی تحریک کا آغاز ضروری تھا۔ برصغیر میں ہندی اور ایرانی تہذیبوں کا ٹکراؤ بھی اس تحریک کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ یہ تحریک دراصل اردو زبان میں فارسی کے عمل دخل کو بڑھانے اور ہندی اثرات کو ختم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ مرزا مظہر جان جاناں کے ساتھ ایک اور اہم نام جو اس تحریک میں شامل ہے وہ انعام اللہ خاں لقیں کا ہے، شاہ حاتم جو کہ ایہام گوئی تحریک کے شاعر تھے، بھی اصلاح زبان کی تحریک کی طرف راغب ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے اصلاح زبان کے لیے متروکات سخن کی ایک فہرست مرتب کی اور اصلاح زبان کے اصول وضع کیے۔ قدیم الفاظ کی جگہ نئے الفاظ کی فہرست مرتب کی جس سے ریختہ پہلی مرتبہ ملک بھر میں رائج ہوئی اور ہر علاقے کی الگ ریختہ کا تاثر ختم ہوا اور اردو زبان میں آہستہ آہستہ الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا چلا گیا۔ اسی زمانے میں اردو کو بے شمار نامور شعرا ملے جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں تین سو چار شعرا کا ذکر کیا ہے۔ میر تقی میر، اور میر درد اسی دور کے شعرا میں شامل ہیں۔ اصلاح زبان کی تحریک کی ایک جاندار آواز سودا کی ہے۔ یہ تحریک جب مصحفی، جرأت، اور حسرت کے دور تک پہنچی تو اس میں جمالیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے یوں کیا ہے۔

”یہ لوگ نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے، نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے، ایک مکان کو دوسرے مکان سے سچائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے، وہی پھول عطر میں بسائیں گے کبھی ہار بنائیں گے کبھی طرے سچائیں گے۔“ (۷)

ناتخ نے اصلاح زبان کی تحریک کے اندر اصلاحی تحریک شروع کی جس میں قواعد و ضوابط وضع کیے گئے۔ اس نے فارسی الفاظ کو رائج کرنے اور پراکرات الفاظ کو خارج کرنے کی سعی کی۔ اس طرح عربی اور فارسی الفاظ کے بے جا استعمال سے اردو مشکل گوئی کی طرف چل نکلی۔ ناتخ کا اردو پر یہ احسان ہے کہ اس نے اردو کی ”صرف اور نحو“ کو ٹھیک کیا۔ تذکیر و تانیث کے اصول بنائے۔ افعال اور مصادر میں

تبدیلیاں کیں۔ غالب نے پہلے مشکل گوئی اختیار کی مگر اہمیت معنویت کو دی۔ بعد میں غالب کے ہاں سادگی نظر آتی ہے۔ اصلاح زبان کی تحریک کے اندر ایک اور تحریک نظر آتی ہے جس نے فارسی لب و لہجہ اختیار کرنے کے بجائے مقامی زبانوں کو اہمیت دینی شروع کر دی۔ رد عمل کی اس تحریک کے اہم نام انشاء، نظیر اکبر آبادی، ابراہیم ذوق، اور بہادر شاہ ظفر ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریک:

فورٹ ولیم کالج کی تحریک اس لحاظ سے رد عمل کی تحریک کہی جاسکتی ہے کہ اس سے پہلے اردو صرف شاعری کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ گوارڈنٹر کا آغاز ہو چکا تھا مگر وہ نثر کا رو باری اور روزمرہ کی ضرورتیں پوری نہیں کرتی تھی۔ اس سے پہلے دکن، گجرات اور اہل دلی کے اقوال پر مشتمل رسالے آٹھویں صدی ہجری میں لکھے گئے۔ خواجہ گیسو دراز کی تصنیف ”معراج العاشقین“ نویں صدی ہجری میں لکھا گیا نمونہ ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے رسالے ”نشاط العشق“ کا ترجمہ اور شرح سید محمد عبداللہ حسینی نے لکھی۔ تاہم اردو نثر کو تخلیقی طاقت ”سب رس“ نے عطا کی اس لحاظ سے ملا وجہی کی تخلیقی نثر ”سب رس“ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد کے مطابق اردو کی پہلی نثری تصنیف ”کر بل کتھا“ ہے جسے فصّٰلی نے تحریر کیا۔

عطا حسین خاں تحسین کی کتاب ”نوطر زمر صبح“، نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھی گئی نثری کتاب ہے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم قرآن بھی اردو نثر کے نمونے ہیں۔ ان میں سادہ الفاظ کا استعمال زیادہ پسند کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کا مقصد جہاں اردو زبان کو اظہار کے مواقع فراہم کرنا تھا وہاں ایک مقصد فارسی کی حاکمیت کو کم کرنا اور مسلمانوں کو فارسی زبان سے دور کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے اردو کو سادہ زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج نے اردو کے تخلیقی ادب میں تصنیف و تالیف کا کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا اور ڈاکٹر گلکرسٹ نے کالج کے طلبہ کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ تر کلاسیکی زبانوں کی مشہور اور مقبول کتابوں کو ہی اردو میں منتقل کرنے کی سعی کی۔ تاہم اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ گلکرسٹ نے اردو نثر کا پہلا ادب پیدا کیا۔ گلکرسٹ سے پہلے اردو نثر کی باقاعدہ روایت موجود نہیں تھی۔ (۸)

فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں نے لفظی ترجمے پر زور نہیں دیا بلکہ ترجمے کو تخلیقی سطح پر لے آئے ہیں۔ ان کی زبان رواں دواں اور تسلسل کی حامل ہے۔ اس سلسلے میں ”باغ و بہار“، ”تو تہا کہانی“، ”مذہب عشق“ زیادہ اہم ہیں جن کے مصنفین بالترتیب میرامن، حیدر بخش حیدری، اور نبھال چند لاہوری ہیں۔ اب فارسی کے بجائے اردو کو زیادہ اہمیت دی جائے گی جس کی وجہ سے داستانوں میں عوام کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی یوں داستان گوئی کے فن کو فروغ حاصل ہوا۔ مختلف داستانوں کو اردو میں منتقل کر کے فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ ان داستانوں میں ”چہار درویش“، ”تو تہا کہانی“، ”آرائش محفل“، ”داستان امیر حمزہ“، ”قصہ گل بکاؤلی“، ”مادھولال کام

کنڈلا“ اور شکلیا وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ میرامن کے قصہ کو فورٹ ولیم کالج کی نمائندہ تحریر کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ جس کی خاص خوبیاں شیرینی بیان اور حسن کلام ہے۔ نمائندہ تحریر یوں ہے:

”آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیروں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ (جس کو استنبول کہتے ہیں) اس کا پایہ تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا آسودہ ایسے چین سے گزراں کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر دن عید اور رات شب برات تھی اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دعا باز تھے سب کو نیست و نابود کر کے نام و نشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھر کے بند نہ ہوتے اور دکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی، مسافر، جنگل میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے۔ کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو“ (۹)

مندرجہ بالا تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی نثر ہی فارسی الفاظ سے کم سے کم استفادہ کیا جاتا، سادہ الفاظ سے نثر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا جاتا۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریک افادی تھی اور مقصدیت لیے ہوئے تھی اس تحریک کا شمار اردو ادب کی متحرک توانا اور جاندار قسم کی تحریکوں میں کیا جاسکتا ہے لسانی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس تحریک نے مشکل گوئی سے چھٹکارا حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ تحریک نثر کی تحریک تھی۔ اس کے تحت سلیس نثر نگاری کو فروغ ملا۔ فورٹ ولیم کالج کے دور میں ہی اردو ناول کا آغاز ہوا اور ساتھ ہی چھاپے خانے قائم ہوئے۔ اردو صرف و نحو، قواعد و ضوابط، اور لغت کی کتابیں لکھی گئیں۔ اس تحریک نے اردو نثر کو ارتقائی منازل سے روشناس کرایا۔ یہ تحریک بھی اردو شاعری کے رد عمل کی تحریک تھی۔

علی گڑھ تحریک:

ادبی و لسانی لحاظ سے فورٹ ولیم تحریک کا مقصد نثری تحریک کے طور پر سامنے آئی۔ اس میں سیاسی پہلو یہ تھا کہ فارسی کے اثر کو کم کیا جائے تاکہ مسلمانوں کا رابطہ اپنے ماضی سے توڑا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس تحریک انگریزوں کو اردو زبان سے روشناس کروانے اور اردو کو عام سرکاری زبان کا کام سرانجام دینے کے قابل بنانا تھا اس کے برعکس علی گڑھ تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کو سیاسی طور پر اور علمی طور پر اپنا مقام و مرتبہ حاصل کرنے کی سعی کی۔ یوں علی گڑھ تحریک بھی رد عمل کا نتیجہ تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو جمود توڑنے غلامی کے حصار کو ختم کرنے اور مستقبل کو روشن کرنے کی ٹھانی۔ علی گڑھ تحریک مختلف جہتوں کی حامل تھی۔ مگر ہم صرف اس کے ادبی و لسانی پہلو کو زیر بحث لائیں گے۔ یہ تحریک انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوئی۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں ”اس تحریک کے اساسی

پہلوؤں میں نئے علوم کا حصول، مذہب کی علوم عقلی سے تفہیم سماجی اصلاح اور زبان و ادب کی ترقی اور سر بلندی شامل ہیں۔“ (۱۰)

زبان و ادب کی ترقی اس قدر ہو گئی کہ آج تک اردو ادب علی گڑھ تحریک کا احسان مند نظر آتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے مقاصد تین زاویوں سے متعین کیے جاسکتے ہیں۔

اول سیاسی زاویہ

دوم مذہبی زاویہ

سوم ادبی زاویہ۔ اردو زبان و ادب کا فروغ

علی گڑھ تحریک کا تیسرا اہم پہلو ادبی ہے۔ اس پہلو کے تحت اردو ادب کے اسالیب بیان متاثر ہوئے اور ساتھ ساتھ زبان کو اظہار کے نئے نئے سانچے میسر ہوئے۔ ادبی سطح پر اس تحریک نے اردو نثر کا ایک سنجیدہ متوازن معیار قائم کیا۔ شاعری میں محقق اور مسجع اسلوب کے بجائے سادگی اختیار کی۔ ساتھ ساتھ ادب میں مقصدیت بھی شامل ہو گئی:

”علی گڑھ تحریک نے زندگی کے جمال کا اجاگر کرنے کے بجائے مادی قدروں کو اہمیت

دی۔ چنانچہ ادب کو بے غرض حسرت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسا مفید وسیلہ قرار

دیا گیا جو مادی زندگی کو بدلنے اور اسے مائل بہ ارتقا رکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

ادب کا یہ افادی پہلو بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا تاہم یہ

اعزاز علی گڑھ تحریک کو حاصل ہے کہ اردو زبان کے دور طفولیت میں ہی اس کی عملی

حیثیت کو اس تحریک نے قبول کیا اور ادب کو عین زندگی بنا ڈالا۔“ (۱۱)

سرسید نے غزل کے بجائے نظم کو اہمیت دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غزل صرف عاشقانہ احساسات و خیالات کے اظہار تک محدود سمجھی جاتی تھی جب کہ نظم سے مقصدیت کا حصول زیادہ آسان تھا۔ اس سلسلے میں ان کی اہم کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے حالی کو ”مسدس مدو جزر اسلام“ لکھنے کی طرف راغب کیا۔ سرسید کے خیال میں قافیہ اور ردیف کی پابندی خیالات کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ ہے اس لیے انھوں نے جامد قواعد و ضوابط سے انحراف پر زور دیا اور تخلیقی رو کو آزادی دینے کے حق میں بات کی۔ نذیر احمد نے کرداروں کے ذریعے ناصحانہ لہجہ اپنایا۔ ان کے ناولوں میں حقیقی زندگی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس طرح نظم اور ناول جیسی اصناف کو ترقی ملی۔ سرسید کے ادبی رفقاء میں شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد زیادہ اہم ہیں۔

علی گڑھ کی تحریک پہلی ادبی تحریک ہے جس نے ادب کے جمالیاتی پہلوؤں سے انغماض برتا ہے اور معنی کو اہمیت دی اس تحریک نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثری اصناف کو فروغ دیا۔ مغربی اور مشرقی فکری نظریات کو ملا کر اردو ادب کو مغرب کے برابر لانے کی کوشش کی گئی۔ اس تحریک نے روح اور وجدان کے بجائے حقیقی زندگی کے رنگوں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔

رومانوی تحریک:

علی گڑھ دراصل ایک مادی اور افادی تحریک تھی۔ یہ تحریک ٹھوس عقلیت کی تحریک تھی۔ اس سے ایک ذہنی انقلاب برپا ہوا۔ ایک طرف مشرق کا روحانی مزاج اور دوسری طرف ٹھوس عقلیت جب نبرد آزما ہوئے تو عمل اور رد عمل کی کیفیت پیدا ہوئی اس طرح مشرق کا روحانی مزاج مکمل طور پر مغربی مادیت میں نہ ڈھل سکا۔ فلسفہ اور سائنس سے استفادہ تو ضرور ہوا مگر صدیوں سے قائم روحانی مزاج اپنی ڈگر سے مکمل طور پر مٹ نہ سکا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک کے رد عمل میں رومانوی تحریک سامنے آئی۔ جذبہ تخیل کی روا بھر کر سامنے آ گئی۔ اس رد عمل کے نمائندہ ادیبوں میں محمد حسین آزاد، میرنا صرعلی دہلوی اور عبدالحلیم شرر شامل ہیں۔

”۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں پروان چڑھنے والی ہندوستان کی رومانوی تحریک کا دور عالمی معاشی تحریکوں اور قومی سیاسی جدوجہد کی شدت کا دور ہے۔ جس میں دو عالمگیر جنگوں کے بد نما داغ بھی شامل ہیں ایسے ہنگامہ خیز دور میں تخلیق پانے والے رومانوی ادب میں نہ مزدور کا پسینہ نظر آتا ہے اور نہ ہی کسان کی تھکن محسوس ہوتی ہے، نہ کہیں گولیوں کی سنسنی سنائی دیتی ہے اور نہ ہی غلاموں کی پکار، اگر ہے تو بدلیسی و اجنبی سرزمینیں اور اس کی نازک بدن خوبصورت حسینائیں یاد دور ماضی کے سنہری دور کی تلاش و جستجو یا خوابوں میں بسنے والی سلمیٰ، پروین اور کوثر۔ تلخ حقائق سے آنکھیں بند کر کے جنس و جذبہ کی رو میں بہنے والی تخلیقات کی مثال دراصل گرد و پیش سے مدھوش کر دینے والی شراب کی سی ہے یہی ماورائیت اور سماجی ذمہ داریوں سے فراز رومانوی تنقید کی بنیاد بنی جس میں کوئی شاعر یا ادیب معاشرے کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں۔ اسے غرض ہے تو محض اپنی داخلیت سے۔“ (۱۲)

محمد حسین آزاد، ایک باکمال انشاء پرداز تھے۔ انھوں نے نیرنگ خیال میں ایسی ایسی تخلیقات پیش کیں جن کو وجدان کی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔ رومانوی تحریک میں ایک اہم نام میرنا صرعلی کا ہے۔ ان کا موضوع و مقصد صرف ادب تھا کسی افادی مقصد کے برعکس صرف ادب کی تخلیق کو مقدم جانا انھوں نے ”صلائے عام“ اور ”فسانہ ایام“ جیسے رسالے جاری کیے۔ سرسید تحریک کے رد عمل کے بارے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

”سرسید کی عقلیت کے خلاف رومانی رد عمل ان کی زندگی میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ رومانیت کا یہ عنصر کسی مخصوص خطے سے وابستہ نہیں تھا بلکہ اس کا دائرہ عمل پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ رومانیت کا ایک زاویہ محمد حسین آزاد کی صورت میں ارض لاہور سے ابھرا، رومانیت کی نمود اور تحریک کو میرنا صرعلی نے دہلی میں

کروٹ دی اور رومانی انداز نظر کی بیشتر تصنیفات شرر نے لکھو سے پیش کیں۔“ (۱۳)

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رومانوی تحریک بھی علی گڑھ تحریک کے رد عمل کے طور پر سامنے آئی اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک کے اثرات ادب پر یکسر ختم نہیں ہوئے۔ بلکہ رومانوی تحریک کی وجہ سے کچھ دہائیوں بعد میں جب رومانوی تحریک کے رد عمل میں ترقی پسند تحریک سامنے آئی تو علی گڑھ تحریک کی مقصدیت اور افادی پہلو دوبارہ ابھر کر سامنے آ گئے۔ بعض ادباء و ناقدین کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک دراصل علی گڑھ تحریک کا ہی تسلسل ہے۔ رومانوی تحریک میں ادب چلتے پھرتے خواب دیکھنے کے عادی ہوتے چلے گئے اور زندگی کی حقیقت سے دوری ہوتی گئی ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس تحریک نے لفظ کو نئے نئے قرینوں سے استعمال کیا۔ اس تحریک نے ایک دور کو مسکور کیے رکھا۔ اور تخلیقی جست عطا کی۔

ترقی پسند تحریک:

رومانوی فن کاروں نے داخلی دنیا سچائی تھی اور خارج سے منہ موڑ کر تخیل کے زور پر فن پاروں کو تخلیق کیا گویا فکر کو خارج سے داخل کی طرف موڑ دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے فکری طور پر جہاں داخل کے بجائے خارج کی طرف تخلیقات کا رخ موڑا وہاں اخلاقیات کو بھی پس پشت ڈال دیا اور ساتھ معاشرے کی اہم قدروں سے بغاوت کر ڈالی۔ ترقی پسند تحریک کا نقطہ آغاز ”انگارے“ کی اشاعت سے ہوا۔ جس کے مصنفین سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر تھے۔ انگارے میں شامل افسانوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کے بجائے دقیقانہ سویت اور رجعت پسندی کے خلاف غصہ پایا جاتا تھا۔ یہ لوگ انقلابی تصورات لیے ہوئے تھے جس کا اظہار انھوں نے انگارے کے افسانوں میں کیا۔ یہ لوگ جذبات سے کام لے رہے تھے جو کہ سراسر مشرق کے مزاج کے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خلاف شدید رد عمل سامنے آیا چنانچہ اس کتاب کو ضبط کر لیا گیا۔ مضطرب کی وجہ سے ”انگارے“ کو زیادہ شہرت ملی اور یہ ایک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہو گئی۔ جس کی وجہ سے لوگ اس کتاب کی طرف زیادہ راغب ہوئے یوں نوجوان ادبا رومانویت سے منہ موڑ کر زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اختر حسین رائے پوری نے ترقی پسند ادب کی وضاحت یوں کی۔

”اول: صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی

اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے
اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لیے دل میں خدمت خلق کا جذبہ
پہلے ہونا چاہیے۔

دوم: ہر ایماندار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور

رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی، یگانگی اور انسانیت
کی وحدت کا پیغام سنائے۔

سوم: ادیب کو رنگ و نسل اور قومیت اور وطنیت کے جذبات کی

مخالفت اور مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام
عنصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے
زندگی کو چھوٹے چھوٹے چوہوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔“ (۱۴)

اختر حسین کے خیالات وہی ہیں جو کہ انگارے میں ملتے ہیں انھوں نے اس تحریک کی تنقیدی جہت مقرر کی اور ادب کو عوامی
بہبود کا ذریعہ قرار دیا۔ اس طرح ترقی پسند ادب زندگی اور ماحول کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی پہلی تحریک ہے
جس کا باقاعدہ منشور تحریر کیا گیا۔ اس تحریک نے ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تحریک کو بڑے بڑے ادباء اور شعرا میسر
آئے ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ ٹانگ ریسٹوران لندن میں اس کا اعلان نامہ جاری کیا گیا۔ اس تحریک کا آغاز
نامساعد حالات میں ہوا اس کے باوجود اس تحریک نے ادب میں ایک فعال حیثیت حاصل کر لی۔ جس سے اردو ادب میں تحریک اور رد عمل
پیدا ہوا۔ اس تحریک کا مقصد ادب کی دائمی قدروں کو اجاگر کرنا، آزادی اور انسان دوستی کو اعلیٰ ادب کی تخلیق میں ایک لازمی جزو قرار دینا تھا۔

”ترقی پسند تحریک کا بنیادی نعرہ ادب برائے زندگی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اس سے
مراد ادب میں اس زندگی کا نقشہ کھینچنا ہے جس میں رہتے ہوئے مظلوم طبقات بے بسی،
یاسیت، احساس محرومی اور ذلت کا شکار ہوتے ہیں اور اس کو بطور ٹھوس اور مجرد حقیقتوں
کے جوں کا توں پیش کیا جاتا ہے اس سلسلے میں ان کرداروں کو پیش کیا جاتا ہے جو ان
حقائق میں رہتے ہوئے شعوری سطح پر تلخ حالات کے دھارے کا رخ موڑنے میں
نظریاتی چٹنگی اور کمٹ منٹ کا ثبوت فراہم کریں اور ان میں امید، حوصلہ اور جرأت
پیدا کر سکیں۔ ایسے کردار اپنی نظریاتی چٹنگی اور کمٹ منٹ کے باعث بالآخر پشیمان یا
شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ جدوجہد اور فتح کی علامت بنتے ہیں۔“ (۱۵)

ترقی پسند تحریک نے مخالفت کے باوجود اپنے نظریات اور مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ لاہور، لکھنؤ اور حیدر
آباد دکن میں اس تحریک کے مراکز کا قیام وجود میں آ گیا۔ اس تحریک کا نعرہ ایسا دلفریب تھا کہ لوگ اس کی طرف کھچے چلے آئے۔ ان
دلفریب نعروں اور دل میں اترنے والے اشعار نے یاسیت کا شکار لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ شاعری کے نمونے یوں ہیں۔

تختِ سلطان کیا، میں سارا قصر
سلطان پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں، اے
وحشت دل کیا کروں

(اسرار الحق مجاز)

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
بول کہ تھوڑا وقت بہت ہے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک

(فیض احمد فیض)

ترقی پسند تحریک کا سیاسی پہلو زیادہ بااثر اور پر زور رہا ہے۔ تاہم اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یہ ایک مؤثر اور فعال تحریک کے طور پر نمودار ہوئی جس نے ادب کی مختلف اصناف میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

”یہ تحریک سرسید کے بعد اردو ادب کا سب سے پر جوش اور پر زور تخلیقی مظاہرہ تھا۔ (۱۶) ترقی پسند تحریک ایک جامع تحریک تھی جس نے ادب کی تین اصناف افسانہ، شاعری اور تنقید کو متاثر کیا اور لازوال فن پارے تخلیق کیے۔

حلقہ ارباب ذوق:

حلقہ ارباب ذوق کی تحریک باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت وجود میں نہ آئی تھی بس چند دوستوں نے مل بیٹھنے کا منصوبہ بنایا اور ایک دوسرے سے فن پاروں کو سننے سنانے کا وسیلہ بہم پہنچانے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ مگر بعد میں چند اہم ادباء کے شامل ہونے سے یہ تحریک ایک فعال ادبی تحریک کے طور پر سامنے آئی جو کہ آج تک کسی نہ کسی طرح مختلف شہروں میں اپنے اجلاس منعقد کرتی نظر آتی ہے۔ جس کا مقصد صرف اور صرف ادب ہے۔

حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک ساتھ ساتھ پروان چڑھیں مگر یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں خارجیت کا عنصر غالب ہے تو حلقہ ارباب ذوق میں داخلیت کو اہمیت حاصل ہے۔ ترقی پسند مادیت کے قائل ہیں تو حلقہ ارباب ذوق والے روحانیت کے۔ ترقی پسند تحریک، ادب برائے زندگی اور حلقہ ارباب ذوق، ادب برائے ادب کے حامی ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کی خوش قسمتی ہے کہ اسے میراجی جیسا نابغہ روزگار میسر آیا۔ میراجی نے حلقہ ارباب ذوق میں جان ڈال دی اور اسے ایک باقاعدہ فعال تحریک کی شکل دی۔ ان کا مطالعہ وسیع اور ادبی ذوق سنجیدہ تھا۔ حلقے میں شمولیت سے پہلے وہ مختلف مغربی ادیبوں پر مضامین لکھ چکے تھے۔ میراجی نے ان مختلف ادیبوں کے فن کا نفسیاتی جائزہ پیش کیا تھا۔ ان کے کہنے پر حلقہ ارباب ذوق میں پڑھے جانے والے مضامین پر تنقید کا سلسلہ شروع ہوا جس سے مختلف ادبا کو اپنے فن پاروں کو سنوارنے کا موقع میسر آیا۔

”میراجی کی شمولیت کے بعد حلقہ ارباب ذوق نے نہ صرف اجتہاد اور ترقی کی طرف

قدم بڑھایا بلکہ اس نے ترقی پسند تحریک کی مقصدیت کے خلاف رد عمل بھی ظاہر کیا اور

اس کی یکسانیت کے مقابلے میں تنوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ حلقے نے

اب ایک ایسی تحریک کی صورت اختیار کر لی جو ادب کی موجودہ حالت کو بدلنے اور فن

کے داخلی حسن کو اجاگر کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ حلقے کی زندگی کے گزشتہ چند عشروں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو خالص ادب کی یہ تحریک بے حد فعال اور توانا نظر آتی ہے۔ یوں اس تحریک نے اولین سطح پر زندگی سے اثرات قبول کیے اور انہیں ادب کی بنت میں شامل کیا اور ثانوی سطح پر زندگی کو بالواسطہ طور پر متاثر کرنے کی کوشش کی۔“ (۱۷)

حلقہ ارباب ذوق کے اجتہاد اور جدیدیت کا تعلق یورپ کی بیسویں صدی کی تحریکوں سے جڑتا ہے۔ ان تحریکوں میں ڈاڈا ازم، سرئیولزم، شعور کی رو، علامتیت اور جدیدیت شامل ہیں۔ تکنیک، اسلوب اور ہیئت کے لحاظ سے حلقہ ارباب ذوق کا تعلق ان تحریکوں سے جڑتا ہے۔

”جیسے جیسے حلقہ ارباب ذوق وسیع ہوتا چلا گیا اس کے اور ترقی پسند تحریک کے مقاصد کے درمیان فرق بھی واضح ہوتا چلا گیا۔ حلقے کے شاعر وادیب اپنی تخلیقات میں ایک ایسا چھوٹا انداز اپنا رہے تھے جو اپنے عہد کے مذاق سخن کے لیے قطعی، اجنبی اور نامانوس تھا جو نئے طرز احساس، رنگ و آہنگ، اسلوب، ہیئت و تکنیک، غرض ہر اعتبار سے اس عہد کے قارئین و ناقدین کے لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا لیکن جہاں تک اس حلقے کے لکھاریوں کو جنس زدہ، مریض، فراریت پسند، شکست خوردہ اور انفرادیت پرست کے حوالے سے ملزم ٹھہرانے کا معاملہ ہے تو اس کا تعلق اپنائی جانے والی جدید ہیئت و تکنیک اور سالیب سے نہ تھا بلکہ ان مخصوص افکار سے تھا جو رجعت پسند فرانسیسی مفکرین سے متاثر میراجی حلقے میں متعارف کر رہے تھے۔“ (۱۸)

حلقہ ارباب ذوق نے زندگی اور اس کے داخلی حسن کو اجاگر کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلے میں کسی موضوع کی پابندی نہ تھی۔ اس تحریک نے سائنس کے ساتھ ساتھ انسان کے داخل یعنی نفسیات کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک نے خارج سے داخل کی طرف کا راستہ اختیار کیا جو کہ ترقی پسند تحریک کے بالکل برعکس تھا۔ یوں دیکھا جائے تو شروع سے لے کر آخر تک اردو کی تمام ادبی و لسانی تحریکیں رد عمل کا نتیجہ ہیں اس رد عمل نے اردو کو بہت توانا ادب تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا جس کی وجہ سے آج اردو ادب دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ”اردو ادب کی تحریکیں“، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۷-۱۳۸
- ۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ”اردو شاعری کا مزاج“، مجلس ترقی ادب لاہور، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۷
- ۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ”تاریخ ادب اردو، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۵۳۱
- ۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، ”اردو ادب کی تحریکیں“، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۶
- ۵۔ ایضاً، ص ۱۸۷
- ۶۔ نور الحسن ہاشمی، (مرتبہ) دلی کا دبستان شاعری، ”اردو اکادمی سندھ کراچی، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۸
- ۷۔ آزاد محمد حسین، ”آب حیات“، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۲۲۹
- ۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ”اردو ادب کی تحریکیں“، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۹
- ۹۔ وقار عظیم، سید، ”ہماری داستانیں“، اردو مرکز، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۹
- ۱۰۔ نسیم قریشی، ”علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۳۹
- ۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ”اردو ادب کی تحریکیں“، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۱۷
- ۱۲۔ روشن ندیم، صلاح الدین درویش، ”جدید ادبی تحریکوں کا زوال“، گندھارا بکس راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۴-۳۵
- ۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ”اردو ادب کی تحریکیں“، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۳
- ۱۴۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ”ادب اور انقلابات، نیشنل ہاؤس سبئی، س۔ن، ص ۲۴-۲۵
- ۱۵۔ روشن ندیم، صلاح الدین درویش، ”جدید ادبی تحریکوں کا زوال“، گندھارا بکس راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص ۴۱
- ۱۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مباحث، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۹۸
- ۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، ”اردو ادب کی تحریکیں“، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۴۵
- ۱۸۔ روشن ندیم، صلاح الدین درویش، ”جدید ادبی تحریکوں کا زوال“، گندھارا بکس راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص ۵۰-۴۹